کچھ بھولی بسری باتیں

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را

بانگ درا میں ایک نظم جس کا عنوان ہے "خطاب بہ نوجوانانِ اسلام" اس کا ایک شعر ہے

گنوا دی ہم نے اسلاف سے جو میراث پائی تھی

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

وہ اسلاف کون تھے؟ اور ان کی میراث کیا تھی؟ نسل نو اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ قدیم درس گاہوں کے طلبہ ہوں یا جدید تعلیمی اداروں کے تلانذہ، دونوں اس مسئلہ سے بے خبر اور تقریباً لاتعلق سے ہیں۔

راقم السطور، مختلف تعلیمی بورڈز سے بحیثیت ممتحن و صدر ممتحن، متعلق رہا ہے۔ ذاتی تجربہ میں عجیب عجیب مضحکہ خیز لطائف آئے۔ فاضل عربی کے ایک امیدوار نے عربی زبان میں ایک مضمون لکھا تھا۔ عنوان سے کسی تعلق کے بغیر کہیں سورہ فاتحہ، کہیں سورہ اخلاص اور کہیں کچھ لکھ کر صفحے پر کرنے کی کوشش کی۔ ایمان مفصل بھی نقل کیا۔ اس کی املاء ملاحظہ ہو۔" آمنتُو باللہ وَ مَلائکَتِھِی وَ کُتُبِھِی...... وَالبَاسِ بَادَل مَوت"

سیکنڈری ایجوکیشن کے ایک امتحان میں کئی امیدواروں نے حضرات انبیاء علیہم السّلام کی مثالیں دیتے ہوئے ابوبکر علیہ السلام، عمر علیہ السلام، علی علیہ السلام، حسین علیہ السلام لکھا اور ایک امیدوار نے تو غضب کر دیا لکھا: فرعون علیہ السلام العیاذ باللہ

اخبارات میں وقتاً فوقتاً پبلک سروس کمیشن کے سامنے پیش ہونے والے امیدواروں کے لطائف آتے رہتے ہیں۔

اقبال مرحوم بڑے آدمی تھے۔ وہ تو پھر بھی کہہ سکتے تھے...... ع

شکایت ہے یارب مجھے خداوندان مکتب سے

ہم گنہگاروں کی کیا مجال کہ معماران قوم کے بارے میں حرف شکایت زبان پر لاسکیں؟ تاہم...... ع

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

یوں نئی نسل کی بے اعتنائی اور لاتعلقی دیکھ کر دل ہمارا بھی تلملا اٹھتا ہے۔ قلب وجگر میں درد سا ہونے لگتا ہے اور آہ نکل ہی جاتی ہے۔ پھر قصور صرف نوخیز نسل ہی کا نہیں یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یہ نصاب تعلیم، قومی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟ یہ نظام تعلیم ملی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے؟ اس لئے حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

گلا تو گھونٹ دیا، اہل مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ

اسی کمی کو ایک حد تک پورا کرنے کے لئے ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اعلیٰ تعلیم کے تمام امتحانات میں اسلامیات لازمی اور مطالعہ پاکستان کا پرچہ شامل نصاب کیا گیا۔ ہم کہاں تک اس بات کو طول دیں۔ برسبیل تذکرہ یہ چند جملے

نوک قلم پر آ گئے ہیں اب ہم اپنے مطلب کی طرف آتے ہیں۔

ایک لمحہ فکریہ:

گلستان اندلس مرحوم (موجودہ نام سپین یا ہسپانیہ) جس کی ڈالیوں میں کم و بیش ایک ہزار سال تک ہمارا آشیانہ رہا۔ اس میں باد مرمر چلی۔ عیسائی انقلاب آیا۔ تو وہاں سے نہ صرف مسلمانوں کو دیس نکالا دیا گیا۔ بلکہ "اسلام" کو بھی رخصت کر دیا گیا۔ مگر کیا وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند پر انگریزی راج مسلط ہوا اور لگ بھگ ڈیڑھ دو سو سال تک یہاں انگریز حکمران رہا۔ پھر اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی گئی۔ چنانچہ

ا) عامۃ المسلمین کے منہ سے لقمہ اور تن سے کپڑا چھین لیا گیا۔ مصنوعی قحط سے وقتاً فوقتاً ان پر بلیات نازل کی گئیں

ب) مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کر کے، ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

ج) ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کی تمویل میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی گئی۔ انگلستان سے پادری درآمد کئے گئے۔ جن کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے عقائد سے بدظن کیا۔ انہیں عیسائی بنانے کے لئے ارمی چوٹی کا زور صرف کیا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی شکم پرور مولوی تک تحریک ارتداد کا شکار ہو گئے۔

د) انگریز کو اقتدار منتقل ہوا تو ہندو آٹھ سو سال کا ادھار وصول کرنے کے لئے میدان میں کود پڑا۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں اسی کا شاخسانہ ہیں۔

ان سب حقائق اور واقعات کے باوجود برصغیر میں مسلمانوں کا قومی اور ملی وجود باقی رہا اور نہ صرف باقی رہا بلکہ دھوم دھڑکے سے باقی رہا تا آنکہ ان کا یہی ملی وجود اور بقاء تحریک پاکستان کی اساس بنا جس کے نتیجہ میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک عالمی نقشے پر ابھر کر سامنے آیا۔

برصغیر ہند کی تاریخ، اندلس سے مختلف رہی تو کیوں؟ اس کے اسباب و علل کیا ہیں؟ وہ کون لوگ تھے جن کی سرگرمیاں، انگریز کے ناپاک ارادوں کے لئے سدراہ ثابت ہوئیں؟ جن کے ایثار و قربانی کے قصے آج بھی مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ اور جن کی بسالت و شجاعت کی داستانیں آج بھی نسل نو کے لہو کو گرما سکتی ہیں۔

ہم رونا اسی بات کا روتے ہیں کہ جب ایک طالب علم تاریخ کی ورق گردانی کرتا ہے تو اسے سراج الدولہ کی شکست، میسور کی جنگوں اور سلطان ٹیپو کی شہادت، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، قیام مسلم لیگ، علامہ اقبال کے خطبۂ صدارت، قائد اعظم اور تحریک پاکستان کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سراسر تعلیم کے ارباب حل و عقد کی تنگ نظری، غفلت اور ناقدری کی دلیل ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُر سد زباغبان
کہ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

زندہ قومیں اپنے ماضی کو یاد رکھتی ہیں، اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے رہنماؤں کے کارناموں کو دہراتی رہتی ہیں ان کی یادگاریں قائم کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ، ہم اور تو کچھ نہیں کر سکتے، آئیے کم از کم ایسے زعماء کے حالات پڑھ کر دیکھیں۔ جن کے زندۂ جاوید عظیم الشان کارنامے ہماری ملی تاریخ کا سرمایہ ہیں۔

فاقصص القصص لعلهم يتفكرون

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی:

جلدی نہ کیجیئے "مولانا" کے لفظ سے کہیں ان آئمہ مساجد کا تصور نہ آجائے جو تعلیم الاسلام یا رسالہ رکن دین پڑھ کر کسی مسجد میں پانچ چھے سو روپے ماہوار پر امامت کی ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں۔ جن کی مولویت کے صرف دو رکن ہوتے ہیں۔ چہرے پر شرعی داڑھی اور سر پر رومال یا عمامہ۔ اس میں شک نہیں کہ بجائے خود یہ بھی امور شروعہ اور کارہائے ثواب ہیں، لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بیشتر امام صاحبان نمازیوں کی علمی ضروریات پوری نہیں کرسکتے نہ کوئی مسئلہ صحیح بتاسکتے ہیں۔ نہ کسی آیت یا حدیث کا ترجمہ صحیح کرسکتے ہیں۔ نہ ان میں کردار کی بلندی نظر آتی ہے۔ نہ نظر و فکر میں وسعت ہوتی ہے۔ تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ یہ رائے قائم کرلیتا ہے کہ علماء سب کے سب ایسے ہوتے ہیں حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ دراصل ائمہ مساجد کے اس طبقہ "علماء" کہنا ہی بجائے خود غلط ہے۔

خاندان، پیدائش اور تعلیم و تربیت:

ہمارے ممدوح، حضرت مولانا احمد اللہ شہید نسباً سید تھے۔ ان کے پردادا ابوالحسن تاناشاہ والئی گولکنڈا اور دادا جلال الدین عادل تھے۔ والد بزرگوار، مولانا محمد علی سلطان ٹیپو شہید کے مصاحبین میں سے تھے۔ آپ کا بچپن نازونعم سے گذرا۔ اونچے گھرانے کے فرد ہونے کی حیثیت سے آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عنفوان شباب ہی میں کتابی علم کے علاوہ فنون سپہ گری کی تربیت حاصل کی۔

جوانی:

بچپن ہی سے آپ سلطان ٹیپو کی شہادت، دشمن کی عیاری اور اپنوں کی بے وفائی کی داستانیں سنتے آرہے تھے۔ میسور اور مدراس کے مسلمانوں کی زبوں حالی، مالدار طبقے کے لوگوں کا بھکاری بن کر دربدر پھرنے کا نقشہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دل دردمند میں ایک ابال اٹھا۔ ریاست کے دھندوں سے آزاد ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان دنوں مرہٹے نظام دکن کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ مولانا احمد اللہ نے دکن پہنچ کر فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ اپنی شجاعت اور دانش مندی سے مرہٹوں کے ارادے ناکام بنادیئے۔ غالباً انہی ایام میں نظام دکن نے آپ کو "دلاور جنگ" کا خطاب دیا۔

سیاحت اور سفر حج:

کچھ عرصہ بعد آپ نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔ شاہ انگلستان کے دربار میں انکی خاصی پذیرائی ہوئی اور وہ بغور انگریز کی سیاست کا مطالعہ کرتے رہے۔ یورپ سے واپسی پر مصر سے ہوتے ہوئے زیارت حرمین شریفین (زادہما اللہ شرفاً) سے مشرف ہوئے۔ پھر ایران سے ہوتے ہوئے برصغیر میں واپس پہنچے۔

زہد و ریاضت اور سلسلۂ بیعت:

جاہ و منصب سے تو دل پہلے ہی اچاٹ ہوچکا تھا انگریزوں کی چیرہ دستیاں اور مسلم عمائدین کی سرد مہری دیکھ کر مولانا کی طبیعت بجھی بجھی سی رہتی تھی مختلف مشائخ طریقت کے پاس حاضر ہو کر ان سے استفاضہ کرتے رہے تاہم ابھی گوہر مراد ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ گوالیار کے ایک بزرگ حضرت محراب شاہ قلندر کی خدمت میں پہنچے۔ ان سے دست بیعت ہوئے۔ مرشد نے شرط لگائی کہ زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کرنی ہوگی۔ تھوڑے

ہی دنوں میں ورد اوراد کی تعلیم کے ساتھ انہیں خلافت سے سرفراز فرما کر رخصت کر دیا۔

اصلاحی سفر:

گوالیار سے رخصت ہو کر آپ اصلاح خلق اور تحریک جہاد کے سلسلہ میں مختلف شہروں میں گئے۔ دہلی کے بعد آپ نے آگرہ کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ نے دیکھا کہ مغل شہزادے اپنی عیاشیوں میں مگن ہیں۔ علماء و صوفیاء کی روش عموماً یاس انگیز نظر آئی۔ یا تو شکمی مسائل ان کے دل و دماغ پر محیط تھے یا جاہ طلبی اور نام نمود کے مذموم مقاصد ان کے پیش نظر تھے۔

مولانا خود ایک ہر دلعزیز عالم تھے۔ ان کی خطابت عوام کے علاوہ خواص میں بہت پسند کی جاتی تھی۔ ان کی تقریر سننے کے لئے ہزاروں کا مجمع لگ جاتا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آگرے میں اقامت کے دوران ان کے اثر و رسوخ سے خائف ہو کر ایک مرتبہ مجسٹریٹ نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ مگر پولیس انہیں گرفتار کرنے کی جرأت نہ کر سکی، بلکہ صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ کچھ علماء اور مشائخ تو پیشہ ورانہ رقابت اور معاصرانہ چشمک کی وجہ سے مولانا کے ہم نوا نہ ہو سکے۔ جن حضرات نے فکری اور ذہنی اتفاق کیا، ان پر بھی انگریزی حکام کو مولانا کی موجودگی میں ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب ادھر ادھر ہوئے تو جھوٹے مقدمے بنا کر مولانا کے ہم نوا علماء کو قید و بند میں ڈال دیا گیا۔

پادری فنڈر کا فتنہ اور اس کا دفاع:

پہلے بھی اشارتاً عرض کیا جا چکا ہے کہ کمپنی کی حکومت کا تسلط ہوا تو سرکاری سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کھلم کھلا ہونے لگی۔ مسیحی لٹریچر دھڑا دھڑ بازار میں آنے لگا۔ نادار مسلمانوں کے ایمان کی بولی لگ رہی تھی۔ عیسائی مبلغین کھل کر اسلام کی تردید اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کرتے پھرتے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں پادری فنڈر یورپ سے ہندوستان پہنچا۔ وہ عربی فارسی زبانوں کے علاوہ اسلامی علوم و فنون سے بھی خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ اس کم بخت نے "میزان حق" نامی ایک کتاب لکھی جس میں مسیحیت کی حقانیت اور اسلام کے ابطال پر لکھ کر علماء اسلام کو للکارا۔ علماء حق اس صورت حال سے نہایت بے چین تھے۔ ادھر سلطنت گئی۔ ادھر دین بھی ہاتھوں سے جاتا نظر آنے لگا۔

مولانا احمد اللہ شاہ اور ان کے احباب کی دلچسپی سے ۱۸۵۵ میں آگرہ کے شہر میں مناظرہ ہوا۔ کیرانہ (یوپی) کے ایک نامور عالم حضرت مولانا رحمت اللہ مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوئے۔ فنڈر کو شکست فاش ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنی رسوائی پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ آگرہ سے چلتا بنا۔

اس واقعہ سے بارہ سال بعد یہی پادری قسطنطنیہ (ترکی) پہنچا۔ حضرت رحمت اللہ کیرانوی اس وقت مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ حضرت کو وہاں سے بلایا گیا۔ وہاں بھی پادری فنڈر کو روسیاہ ہونا پڑا۔ مولانا رحمت اللہ مناظرۂ قسطنطنیہ سے بیس سال بعد مکہ معظمہ میں فوت ہوئے۔ مکہ مکرمہ کا مدرسہ صولتیہ انہی کی یادگار ہے۔ یہ ادارہ آج بھی وہاں پر شاندار دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔

جملۂ معترضہ:

انگریز، اپنی رواداری اور اخلاقی شرافت کا بڑا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ ان کی شرافت کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو کہ

حضرت مولانا رحمت اللہ کی ہجرت کے بعد انگریزی حکومت نے ان کی جائداد پر قبضہ کر لیا اور اپنی آتش انتقام کی تسکین کے لئے ان کے مکان کو بنیادوں کی حد تک کھود کر اس پر ہل چلوا دیئے۔

مولانا احمد اللہ شاہ کی مجاہدانہ سرگرمیاں:

اب اپنے شیخ کی اجازت سے حضرت شاہ صاحب نے آگرہ سے لکھنؤ کا رخ کیا۔ مریدین کی بھاری جمعیت آپ کے ساتھ تھی۔ کانپور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ یہاں کے مسلمانوں میں آپ کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سلسلۂ ارشاد و ہدایت کے علاوہ آپ کی خطابت رنگ لائی۔ اس دوران میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پیش آئی۔ میرٹھ کی چھاؤنی سے آغاز ہوا۔ انگریزوں کے خلاف غیظ و غضب دلوں میں پہلے سے موجود تھا چند ہی ایام میں جگہ جگہ بغاوت کے شعلے بلند ہونے لگے۔

لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے ۱۸۵۶ میں معزول کر دیا تھا۔ اس کے دس سال کے بیٹے برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ جس کی والدہ حضرت محل سربراہ مقرر ہوئی۔ مگر زیادہ تر اختیارات ناصر الدولہ علی محمد خان کے پاس تھے۔ لکھنؤ کے عوام برجیس قدر کی تخت نشینی سے خوش نہ تھے۔ انہوں نے عملاً حضرت احمد اللہ شاہ کو اپنا فرماں روا بنالیا۔ یوں تو ناصر الدولہ بھی انگریزوں کے خلاف تھا۔ مگر وہ روپے پیسے کا بڑا لالچی تھا۔ لوٹ کھسوٹ نے اسے بدنام کر دیا۔ اس کے برخلاف حضرت احمد اللہ شاہ رحم دل، عدل گیر اور ہمدرد مزاج تھے۔ اب لکھنؤ میں دو متوازی حکومتیں چل رہی تھیں۔ کانپور، اللہ آباد اور فیض آباد وغیرہ کے لوگ بھی شاہ صاحب کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یوں انہوں نے ایک بھاری فوج بنالی۔ بہادر شاہ ظفر کا بھائی مرزا کوچک سلطان، اس کا نواسہ فیروز شاہ اور جرنیل بخت خاں و دیگر علماء اپنے اپنے مجاہد دستوں کے ہمراہ لکھنؤ پہنچ گئے۔

انگریزی فوجوں نے دہلی کی کارروائی سے فارغ ہو کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ یہاں کئی محاذوں پر مجاہدین اور انگریزوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مجاہدین کی طاقت دو حصوں میں منقسم تھی۔ ہم آہنگی کے فقدان نے انگریزوں کو کئی معرکوں میں شکست کھانے کے باوجود ابھرنے کا موقعہ دیا۔ ناصر الدولہ اور حضرت محل نے فرار کی راہ اختیار کی۔ نتیجتہً حضرت شاہ صاحب، شہزادہ فیروز اور جرنیل بخت خان کے ہمراہ شاہ جہاں پور کو روانہ ہو گئے۔ مئی ۱۸۵۸ء میں یہاں انگریزی افواج سے دو دو ہاتھ ہوئے۔ قرب و جوار میں حضرت شاہ صاحب کی حکومت قائم ہو گئی۔ بد قسمتی کی بات کہ فیروز شاہ خود بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی روش منافقانہ رہی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ غیروں کی دشمنی سے زیادہ اپنوں کی بے وفائی نے نقصان پہنچایا۔ چنانچہ اب شاہ صاحب کے لئے حالات سخت ہو گئے۔ انہیں اپنی عملداری سے نکلنا پڑا۔ ادھر انگریزوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص انہیں گرفتار کر کے زندہ یا ان کا سر لادے تو اسے پچاس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔

شہادت: روپوشی کی شکل میں پھرتے پھراتے جون ۱۸۵۸ء میں حضرت شاہ صاحب پوائن کے راجہ بلدیو سنگھ کے بلاوے پر اس کے ہاں پہنچ گئے۔ انعام کے لالچ میں بلدیو سنگھ اور اس کے بھائی نے گولیوں سے آپ کا سینہ چھلنی کر دیا۔ بلدیو سنگھ نے آپ کا سر کاٹ کر حکام کمپنی کے پیش کیا اور اعلان شدہ انعام وصول کیا۔ آپ کی نعش کو آگ میں جلا دیا گیا۔ سر ایک عرصے تک شاہجہاں پور کی کوتوالی میں لٹکا رہا۔ بعد میں اسے ایک مسجد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً